Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:4، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

اُردو ناول میں ماحولیاتی تحفظ کی بازگشت

The Echo of Environmental Conservation in the Urdu Novel

Dr. Tahir Abbas Tayib,
Assistant Professor Department of Urdu,
GC Women University, Sialkot
Dr. Syed Tariq Hussain Rizvi
Assistant Professor
Department of Urdu, Shah Abdul Latif University, Khairpur
Zaiba Gulzar,
Lecturer Department of Urdu,
The University of Lahore, Lahore

ڈاکٹر طاہر عباس طیب
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر سید طارق حسین رضوی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، شاہ عبد اللطیف یونیورسٹی، خیرپور
زیبا گلزار
لیکچرار شعبۂ اُردو، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

Abstract

This study explores the representation of environmental conservation in the Urdu novel, highlighting the evolving ecological consciousness within modern Urdu fiction. As the world faces severe environmental crises climate change, deforestation, water scarcity, and pollution Urdu novelists have increasingly reflected these concerns in their creative narratives. The research investigates how the Urdu novel serves as a literary response to the ecological degradation of the modern age, blending aesthetic imagination with ethical and environmental awareness. Through the lens of ecocriticism, this paper examines how writers such as Mustansar Hussain Tarar, Amna Mufti and khalid javed reimagine the relationship between human beings and nature. Their novels portray rivers, deserts, forests, and seasons not merely as scenic elements but as living entities that carry moral, cultural, and spiritual meanings. The destruction of nature in these works mirrors the disintegration of human values and social harmony, suggesting that the survival of humanity is inseparable from the preservation of the environment. Ultimately, this paper argues that the Urdu novel acts as a mirror of ecological thought, resonating with the global discourse on sustainability and environmental ethics. It emphasizes that environmental preservation in Urdu fiction is not confined to a theme but emerges as a moral and aesthetic philosophy an echo of humanity's deep connection with nature and its responsibility toward the planet.

Keywords: *Urdu Novel, Environmental Conservation, Ecocriticism, Nature, Climate Change, Sustainability, Aesthetics*

کلیدی الفاظ: اردو ناول، ماحولیاتی تحفظ، ماحولیاتی تنقید، فطرت، موسمیاتی تبدیلی، پائیداری، جمالیات

ماحول انسانی زندگی کا ایک بنیادی اور ناگزیر جزو ہے، جس کے بغیر نہ صرف انسانی بقاء ممکن ہے بلکہ تاریخ اور تہذیب کا ارتقاء بھی اسی سے مشروط ہے۔ موسمیاتی اور فطری تغیرات نہ صرف مخصوص علاقوں بلکہ پورے خطے، انسانوں کے طرزِ فکر، طرزِ حیات اور سماجی رویوں پر گہرے اثرات

مرتب کرتے ہیں۔ موجودہ دور جو سائنسی ترقی، صنعتی انقلاب اور ٹیکنالوجی کی فراوانی کا زمانہ ہے، انسان نے کئی آسائشیں حاصل کی ہیں، لیکن ان کے حصول کی قیمت فطری ماحول کی بربادی اور قدرتی توازن کی تباہی کی صورت میں چکانی پڑی ہے۔

ادب اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ماحولیاتی مظاہر کا آئینہ دار ہے، اس لیے وہ ان تبدیلیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ماحولیات کے حوالے سے جن سنگین مسائل پر آج عالمی تنظیمیں اور سائنسی ادارے سرگرمِ عمل ہیں، وہی مسائل ادب کے دائرۂ اظہار میں بھی پوری شدت سے در آئے ہیں۔ دیگر عالمی ادبیات کی طرح اردو ادب نے بھی ماحولیاتی شعور کے اس نئے تنقیدی ڈسکورس کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کیا ہے بلکہ اسے تخلیقی سطح پر برتا بھی ہے۔

ناول نہ صرف زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ جدید نظریات، فکری رجحانات اور تخلیقی اظہار کا مرکز و منبع بھی ہے۔ اکیسویں صدی کو ہم ناول کی صدی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ناول نے عصرِ حاضر کے پیچیدہ ترین موضوعات کو اپنے دامن میں سمو لینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اُردو ناول، جو پہلے ہی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور سماج کے گہرے شعور کا حامل ہے، اب عصرِ حاضر کے المیوں خصوصاً ماحولیاتی اور موسمیاتی بحران کو بھی مؤثر طور پر پیش کیا ہے۔ ماحولیاتی مسائل اور فطری تغیرات پر اظہار کا رجحان عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ناول میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے حالیہ برسوں میں ایک نیا اور معنی خیز رخ اختیار کیا ہے۔ یہ محض قدرتی آفات کا بیان نہیں، بلکہ گہرے فکری و اخلاقی بحران کا آئینہ بھی ہے، جس میں انسان اپنے ہی اعمال کے نتیجے میں فطرت کے بگاڑ کی وجہ سے غیظ و غضب کی زَد میں ہے۔

اُردو ناول میں فطرت کے تحفظ، موسمیاتی تبدیلیوں کے مہلک اثرات اور انسان کی ماحول دشمن سرگرمیوں کے خلاف ایک گہرا تخلیقی احتجاج ملتا ہے۔ ناول نگاروں نے اس خیال کو اجاگر کیا ہے کہ انسان نے اپنی خود غرضی، لالچ اور ترقی کی اندھی دوڑ میں اس دنیا کے فطری توازن کو برباد کیا۔ جس کی وجہ سے آج کا انسان ماحولیاتی تباہی کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ موسمیاتی تبدیلیاں، زمینی بگاڑ، پانی کی کمی، درجہ حرارت میں اضافہ، آلودگی اور حیاتیاتی تنوع کی زوال پذیری، یہ سب تخلیقی افق پر بھی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ دنیا بھر میں موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی بحران آج سنگین عالمی مسئلہ بن چکا ہے۔ ناول نگاروں نے اس حوالے سے انسانی شعور میں وسعت پیدا کی اور فکری مکالمے کو جنم دیا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں اردو ناول کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا جو موسمیاتی بحران اور ماحولیاتی تحفظ کے حوالے سے بیانیے کا حصہ ہیں۔ اس مطالعے میں اُردو کے چند اہم ناولوں کو ماحولیاتی تنقید (Eco Criticism) کے زاویے سے پرکھا گیا ہے۔ ان ناول نگاروں نے فطرت، زمین، پانی، جنگلات اور ماحول کو باقاعدہ فکری اور تہذیبی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور جدید ناول کس حد تک ماحولیاتی بیداری کو فروغ دیتا ہے؟ انسان اور فطرت کے تعلق کو نئے تناظر میں پیش کیا گیا جو ماحولیاتی شعور کی موجودگی کو اجاگر کرتے ہوئے فکری جہت کو تقویت دیتی ہے۔ یہ ناول، نہ صرف فرد اور سماج کا آئینہ ہیں، بلکہ زمین، فطرت اور ماحول کے تحفظ کا پیغام بھی ہے۔

ماحولیاتی شعور اور موسمیاتی بحران جیسے اہم عصری موضوعات کو اجاگر کرنے والے ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ کا بہاؤ، آمنہ مفتی کا پانی مر رہا ہے اور خالد جاوید کا ایک خنجر پانی میں نمایاں ہیں۔ ان تخلیقات نے نہ صرف فطرت کے زوال، آبی وسائل کی قلت، ماحولیاتی عدم توازن اور

تہذیبی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے، بلکہ ان مسائل کو نہایت گہرائی، تخلیقی باریکی اور فکری سنجیدگی کے ساتھ ناول کے بیانیے میں سمویا ہے۔ یہ ناول محض ماحول کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا بیان نہیں، بلکہ انسان، فطرت اور تہذیب کے باہمی تعلق کی گتھی کو بھی سلجھانے کی فکری کاوش ہے۔ ان ناولوں میں ماحولیاتی بحران کو ایسی تخلیقی زبان دی گئی ہے جو نہ صرف قاری کو چونکاتی ہے بلکہ اُسے اپنی ذمہ داریوں پر غور کرنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔

ماحولیاتی تحفظ کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول بہاؤ ایک منفرد اور نمائندہ تخلیق ہے، جو نہ صرف تہذیبی ارتقاء، فطرت اور انسان کے باہمی رشتے کو گہرائی سے بیان کرتا ہے بلکہ ماحولیاتی بحران جیسے اہم اور عصری موضوع کو بھی اپنے بیانیے کا حصہ بناتا ہے۔ اگر ناول کا مطالعہ ماحولیاتی تناظر سے کیا جائے تو اس میں کئی گہرے اور فکری پہلو سامنے آتے ہیں۔ بہاؤ صرف تہذیبی زوال کی داستان نہیں بلکہ قدرتی وسائل، بالخصوص پانی کی قلت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران کی علامت بھی ہے۔ خود مصنف کے بقول، یہ ناول اس لمحے جنم لیتا ہے جب وہ آدھی رات کو پانی کے گلاس پر غور کرتے ہوئے اس کی اہمیت کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسا تخلیقی لمحہ تھا جس نے اردو ناول کو ایک لازوال ماحولیاتی بیانیہ دیا۔ ناول کا آغاز ہی ایک پرندے کی موت سے ہوتا ہے جو پانی کی تلاش میں نیچے آتا ہے، لیکن زمین پر جھیل سوکھ چکی ہوتی ہے۔ یہ ابتدائی منظر محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ماحولیاتی زوال کا استعارہ ہے، جہاں فطرت کی زندگی بخش قوتیں آہستہ آہستہ ناپید ہو رہی ہیں۔ پانی کی قلت اور اس کی تلاش ناول میں انسانی جدوجہد کا مرکزی موضوع ہے۔ بستی کے مکین نہ صرف پانی کی قلت کا شکار ہیں بلکہ خوراک، حیاتیاتی تنوع، اور فطرت کے دیگر عناصر بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ناول میں مٹتی ہوئی تہذیب کا منظر نامہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان فطرت کے ساتھ اپنا ہم آہنگی کا رشتہ کھو دیتا ہے، تو نہ صرف تہذیب و تمدن، بلکہ انسانی زندگی کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بہاؤ اس لحاظ سے محض تاریخی یا تہذیبی ناول نہیں، بلکہ ماحولیاتی آگہی کا حامل تخلیقی مرثیہ ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم نے فطرت کے ساتھ اپنا رشتہ نہ جوڑا تو ہماری تہذیبیں بھی خشک جھیلوں کی مانند ختم ہو جائیں گی۔ ناول کا پس منظر قدیم وادی سندھ کی تہذیب، جہاں دریائے ہاکڑہ کے خشک ہونے کا ذکر ناول کی مرکزی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> "ناول کی دنیا میں مستنصر کا ناول بہاؤ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں جو قصہ ہے اس سے مشابہہ کوئی دوسرا قصہ کسی اور ناول میں نظر نہیں آتا۔ اس میں ایک ایسی بستی کا حال چال ہے جو سیکڑوں برس پہلے موجود تھی اور جس کے دریا سوکھ رہے تھے اور جس کے باسی کہولت اور سستی کا شکار تھے اور جنھوں نے اپنی کھڑکیاں بند کر دی تھیں تاکہ تازہ ہوا اندر نہ آئے۔ یہ بستی سندھو گھاگرا کے کنارے آباد تھی اور جو معدوم ہوتی جا رہی تھی۔"(۱)

ناول میں ماحولیاتی بحران کی علامتوں میں، دریا کا خشک یا اس کا بہاؤ رک جانا تہذیب کے زوال اور ماحولیاتی بحران کی علامت ہے۔ یہ ماحولیاتی تبدیلی کو ایک علامتی سانحہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ناول میں زمین، پانی اور موسم کے بدلتے ہوئے مظاہر در حقیقت انسانی زندگی پر پڑنے والے ماحولیاتی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دریا کے کنارے بسنے والی قوم کی ثقافت اور زندگی فطرت سے جُڑی ہوئی ہے۔ جیسے ہی دریا خشک ہوتا ہے، تہذیب بکھرنے لگتی ہے۔ ناول میں انسانی لالچ اور فطرت سے تصادم کو دکھایا گیا ہے، انسان جو فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے بجائے اس پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں تباہی و بربادی ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے شاعرانہ نثر، علامتی انداز، اور کرداروں کے ذریعے

فطرت اور تہذیب کے تعلق کو گہرائی سے بیان کیا ہے۔ کرداروں کی فکری کشمکش اور ان کا ماحول سے رشتہ ماحولیاتی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ بہاؤ کو ایکو-فکشن (eco-fiction) کے ابتدائی اور نمایاں نمونوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

"گئے برسوں میں پانی یہاں تک آتے تھے۔ اُس نے قدموں میں بچھی سفید مٹی کی تہہ کو دیکھا۔۔۔ ہر برس یہ جھیل بھرنے کی بجائے کچھ اور سوکھ جاتی تھی، کچھ اور سمٹ جاتی تھی۔ ہر برس پانی کے گرد ایک اور دائرہ بن جاتا، جہاں تک پانی پہلے تھا اور اب سُوکھ چکا تھا" (۲)

ناول بہاؤ کا ابتدائی حصہ ہی درحقیقت ایک مکمل ماحولیاتی نظام کی گزر بسر، اس کی مرکزیت اور اس کے تدریجی زوال کو مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ ناول نہ صرف فطرت کی بقا کا منظر نامہ تشکیل دیتا ہے بلکہ اس کی تباہی، بگاڑ، اور فنا کا المیہ بھی واضح کرتا ہے۔ اس بگاڑ کے اسباب میں ایک نمایاں سبب انسان کی اپنی سرگرمیاں ہیں، جن سے فطری توازن درہم برہم ہوتا ہے۔ تارڑ کے بیانیے میں اس نکتہ پر خاصا زور ہے کہ فطرت میں شامل تمام عناصر انسان، درخت، پودے، پہاڑ، پانی، آپس میں نہایت گہرا وجودی اور حیاتاتی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی ربط ہی دراصل فطرت کے توازن کی بنیاد ہے، اور اسی توازن کا ٹوٹنا ایک تہذیب کے زوال کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ ناول میں انسان کے قدیمی پیشے زراعت اور کھیتی باڑی کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کسانوں کی زندگی، کھلیانوں کے مناظر، زمین سے جُڑے رشتے اور موسمی تغیرات کی اثر پذیری، سب کچھ فطرت کے ساتھ انسانی ہم آہنگی کا ثبوت ہیں۔ یہ زراعتی مناظر دراصل انسان کی معیشت، ثقافت اور فطرت سے جُڑے رشتوں کی علامت ہیں۔ ناول میں ان مناظر کو نہ صرف شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے بلکہ ان میں معدوم ہوتی زمین کی زرخیزی اور زندگی کی جدوجہد کو بھی علامتی سطح پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اسی طرح، ناول میں مذہبی رسومات اور ان کے فطری عناصر سے تعلق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ رسومات، جن میں پانی، دھوپ، درخت، جانور اور فضا کو زندگی بخش عناصر کے طور پر مانا گیا ہے، دراصل اس بات کی غماز ہیں کہ قدیم انسانی معاشروں میں فطرت کی تقدیس کو زندگی کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ بہاؤ میں یہ تصور لطیف انداز میں پنہاں ہے کہ جب انسان فطرت کو مقدس ماننا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے بعد نہ صرف ماحول کا توازن بگڑتا ہے، بلکہ تہذیبیں بھی اپنی بنیادیں کھو دیتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ بیانیہ محض تاریخی یا تخیلاتی نہیں بلکہ ایک ادبی تنبیہ بھی ہے۔ ایک فکری انتباہ جو آج کے موسمیاتی بحران سے آنکھیں ملانے پر مجبور کرتا ہے۔ بہاؤ کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فطرت کی بقاء، تہذیب کی بقاء ہے۔ فطرت کا زوال، انسان کی شکست ہے۔ پورے ناول میں شروع سے لے کر آخر تک پیاس اور دریاؤں کی خشکی کا نوحہ بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں سرسوتی دریا کے خشک ہونے سے تہذیب کے زوال کو بھی دکھایا گیا ہے:

"گھاگھرا کے اونچے کناروں کے اندر اب خشک راستہ آخر تک چلے گا جس میں صرف ٹھیکریاں ہوں گی اور خشک گھونگھے ہوں گے اور پکلی کے آوے سے کبھی دھواں نہیں اٹھے گا اور اس چیتر کی چاندنی میں گھاگھرا کے پانی کبھی نہیں لشکیں گے۔۔۔ وہاں جہاں کبھی رُکھ تھے اور اب ریت تھی اور ایک سوکھی ٹہنی تھی۔۔۔ وہاں جہاں کبھی دریا تھا اور اب اونچے خالی کنارے تھے اور ان میں پانی کی بجائے دَھم دَھم کی آواز ٹھہرتی تھی اور تیرتی تھی۔۔۔" (۳)

گویا ہمارا عہد بھی دریائے گھاگرا کے کنارے آباد بستی کی طرح اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول بہاؤ صرف ایک تاریخی یا تہذیبی داستان نہیں بلکہ ایک ماحولیاتی مرثیہ بھی ہے۔ اس میں فطرت کی خاموش تباہی، پانی کی اہمیت، اور انسانی رویوں کے اثرات کو بڑے گہرے اور علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ موجودہ دور کے موسمیاتی بحرانوں کو سمجھنے اور ان پر ادبی انداز میں گفتگو کرنے کے لیے "بہاؤ" ایک نمائندہ اردو ناول ہے۔

آمنہ مفتی کا ناول پانی مر رہا ہے، کا آغاز ایسے منظر نامے سے ہوتا ہے جو ماضی میں دریاؤں، ندیوں، نہروں اور پانی کی وافر موجودگی کا غماز ہے، لیکن اب یہ سرزمین آہستہ آہستہ بنجر، ریتلی اور بھوری ہوتی جا رہی ہے۔ پنجاب کی زرخیز دھرتی، جو کبھی پانیوں کی فراوانی سے جانی جاتی تھی، اب پانی کی قلت، خشک سالی اور ماحولیاتی زوال کی علامت بن چکی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار، میاں اللہ یار، اپنے بیٹے کے ہمراہ اس متغیر اور اجنبی ہوتی ہوئی سرزمین کا سفر کرتا ہے۔ یہ سفر محض جغرافیائی تبدیلی نہیں بلکہ تہذیبی، فطری اور روحانی انحطاط کا بھی ہے۔ آمنہ مفتی نے ناول میں انوکھے اور حیرت انگیز مناظر پیش کیے ہیں۔ ایسی مچھلیاں جن کے چہروں پر انسانی خصائص ابھرتے ہیں اور عجیب و غریب پرندے جو فضا کو ایک مستقل دہشت اور اضطراب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ یہ عناصر ایک ایسی تمثیلی اور ماحولیاتی فضا تشکیل دیتے ہیں جو قاری کو نہ صرف بصری سطح پر متاثر کرتی ہے بلکہ فکری طور پر بھی جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اس ناول میں دریاؤں کے خشک ہو جانے کا ذکر شدّت، تسلسل اور شعوری اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ محض پانی کے ختم ہونے کا نوحہ نہیں، بلکہ ایک گہرے تہذیبی اور فکری بحران کا استعارہ ہے۔ آمنہ مفتی نے جس مہارت سے ماحولیاتی زوال کو پیش کیا ہے۔ دریاؤں کی خشکی ناول کے بیانیے میں محض ایک قدرتی سانحہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی المیہ بن کر ابھرتی ہے۔ ”جو تیرا ہے، وہ تیرا ہے۔ جو کسی کا ہے وہ تیرا کیسے ہو گیا؟ جو، ہرا ہے اسے تو سکھا نہیں سکتا اور جو سوکھا ہے اسے تو ہرا نہیں سکتا۔“(۴)

آمنہ مفتی نے پانی کی تقسیم کے مسئلے کو بڑی مہارت اور حساسیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ تنازعہ صرف دو ممالک پاکستان اور بھارت کے درمیان سیاسی کشمکش تک محدود نہیں بلکہ ایک گہرے ماحولیاتی اور انسانی المیے کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ انسان ہمیشہ سے ان قدرتی وسائل پر قبضے کی کوشش کرتا رہا ہے جو اصل میں اس کے اختیار میں ہی نہیں۔ پانی، جو ازل سے قدرت کی امانت ہے، کو انسان نے سرحدوں، معاہدوں، اور سیاسی مفادات کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ پانی پر حقیقی معنوں میں قبضہ ممکن نہیں۔ آمنہ مفتی نے نہ صرف پانی کی تقسیم کی پیچیدگی کو اجاگر کیا ہے۔ دریا انسانی سازشوں اور حدود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی تناظر میں تقسیم ہند کا بھی حوالہ دیتی ہیں، جہاں زمین کی لکیریں تو کھینچ دی گئیں، مگر دریا اور پانی جیسے قدرتی عناصر ان سیاسی فیصلوں کے سامنے خاموش مگر مستقل مزاحمت بن کر کھڑے ہیں۔ انھوں نے اس المیے کو صرف پانی کی کمی کا دکھ نہیں بلکہ ماضی سے جڑے تمام تہذیبی، روحانی اور فطری رشتوں کے ٹوٹنے کی تکلیف کو بیان کیا ہے۔ دریا، جو صدیوں سے حیات بخشنے والے عناصر تھے، اب قبضے، سیاست، اور تقسیم کی زبان میں یاد کیے جا رہے ہیں اور یہی تبدیلی ناول کا الم انگیز پہلو بن جاتی ہے۔

آمنہ مفتی کے لیے دریا اور پانی محض فطری مظاہر نہیں بلکہ گہرے جذباتی، تہذیبی اور علامتی معنی رکھتے ہیں۔ ناول میں دریا کی تقسیم کربناک سانحہ بن کر ابھرتی ہے کہ وہ بار بار اس کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ گویا ہر مسئلے کی جڑ، بگاڑ کی بنیاد اور زخم کی ابتدا تقسیم سے جڑی ہوئی ہے۔ دریا کا بچھڑنا، پانی کا چھن جانا، محض قدرتی زیاں نہیں بلکہ انسانی زوال کا اشارہ ہے۔ انھوں نے مرد کو بھی دریا سے تشبیہ دی ہے، جو بظاہر سادہ علامت ہے، مگر دراصل انسانی اقدام، اختیار اور اس کے نتائج کی جانب اشارہ ہے۔ آمنہ مفتی صرف ماحول یا سیاست کی بات نہیں کر رہیں، بلکہ انسانی فطرت، جنس، اختیار اور اخلاقی ذمے داری کو بھی علامتی زبان میں بیان کرتی ہیں۔

”لیکن یہ بھی سن لے، دریا کو بانٹ نہیں سکتے۔ دریا جہاں بہتا ہے وہیں کا ہوتا۔“ (۵)

ناول میں دریا کی تقسیم، ڈیم کی تعمیر اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحولیاتی اور انسانی نقصانات کا مسلسل ذکر ہے۔ وہ دریا کے بہاؤ میں مداخلت کو ایک فطری جرم تصور کرتی ہیں اور اس کے خلاف نہ صرف بارہا آواز بلند کرتی ہیں، بلکہ قاری کو اس سنگین معاملے کی تہوں میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہیں۔ منگلا ڈیم کی تعمیر کے حوالے سے ناول میں جو انکشافات کیے گئے ہیں، وہ محض تاریخی نہیں بلکہ ماحولیاتی تنقید کا ایک گہرا اظہاریہ ہیں۔ ڈیم کی تعمیر سے ہونے والی نقل مکانی، ماحولیاتی توازن کا بگڑنا اور پانی کے فطری بہاؤ کی رکاوٹ، یہ سب اشارے ہیں کہ انسان نے فطرت کو

تسخیر کرنے کے زعم میں خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس تناظر میں عرفان صاحب جیسے کردار نہایت اہمیت کے حامل ہیں، جو مصنفہ کی فکری ترجمانی کرتی ہیں۔ آمنہ مفتی کے نزدیک پانی کا وجود انسان، زمین اور فطرت، تینوں کے درمیان مقدس ربط ہے، جس کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ وہ نہروں، بیراجوں اور آبی ذخائر کے منصوبوں پر نہ صرف روشنی ڈالتی ہیں بلکہ ان کی تعمیر اور کھدائی سے جڑے ماحولیاتی اثرات کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ آمنہ مفتی قاری کو یہ باور کراتی ہیں کہ آبی نظام میں کی جانے والی ہر مداخلت براہِ راست انسانی بقا کے لیے نقصان دہ ہے۔

"انسان نے اپنے بچاؤ کا سب انتظام کر لیا تھا لیکن وہ بہت سی مخلوقات کو بھول گیا تھا۔ مخلوقات کو تو خدا بھی نہیں بھولتا۔۔۔ خالق اپنی تخلیق کو اس وقت تک نہیں مٹاتا جب تک اسے مٹانا ناگزیر نہ ہو جائے۔"(۶)

آمنہ مفتی نے آبی مخلوقات کا ذکر استعاراتی انداز میں کیا ہے۔ برسات کے ساتھ اترتی ہوئی پراسرار مچھلیاں اس بات کی علامت ہیں کہ فطرت انسان کی غفلت، ظلم اور ناانصافی کا ردعمل دکھا رہی ہے۔ منظور اور نازنین کے ہاں پیدا ہونے والی لڑکی جل پری، جو آدھی مچھلی اور آدھی انسان ہے، محض عجیب الخلقت وجود نہیں بلکہ انسانی فطرت اور آبی حیات کے درمیان ٹوٹتے تعلق کی علامت ہے۔ اس تباہی کے مقابل کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو دریاؤں کو بچانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ گویا وہ امید کے آخری چراغ ہیں، جو اس اندھیرے میں فطرت کے لیے مزاحمت، محبت اور وفاداری کی علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہیں کہ اگرچہ انسان نے فطرت کو زخمی کیا ہے، مگر اس کے بچاؤ کی آخری مہلت ابھی بھی باقی ہے۔

آمنہ مفتی نے اپنی کہانی کی بنیاد صرف سنی سنائی یا روایتی لوک بیانیے پر نہیں رکھی۔ ان کے ہاں ایسے کردار بھی موجود ہیں جو ماحول، پانی، اور فطرت کے معاملات کو صرف جذبات یا عقیدت کے بجائے سائنسی منطق، تحقیق اور زمینی حقائق کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ان تمام عجیب و غریب مظاہر، جیسے دریا کی خشک سالی، یا عجیب الخلقت پیدائش، کے پس منظر میں سائنسی توجیہات، موسمیاتی تغیرات اور ماحولیاتی تبدیلی کے اصولوں کو بھی پیش کرتی ہیں۔ یہ ناول صرف فنٹیسی نہیں، بلکہ اسے حقیقت پسندانہ ماحولیاتی فکشن کا درجہ رکھتی ہے۔ آمنہ مفتی کا بیانیہ قاری کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ فطرت سے جڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس ضمن میں ناول کے کردار دو واضح دھڑوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک جانب عرفان صاحب، دادی، مدھو، مسز بترا، منظور کی بیٹی جل پری اور جوگی جیسے کردار ہیں، جو قدرتی ماحول، دریاؤں، پانی، اور فطرت کے تحفظ کی علامت ہیں۔ یہ کردار فطرت سے روحانی ربط اور حیاتیاتی احترام کا استعارہ ہیں۔ دوسری جانب میاں اللہ یار، اسرار اور ان کے ساتھی ہیں، جو زمین کو آباد کرنے کے لیے قدرتی نظام کو تہس نہس کرتے اور دریا کی فطری روانی کو روکتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر ایکو سسٹم کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں۔ آمنہ مفتی کے نزدیک دریا صرف پانی کا ذریعہ نہیں، بلکہ تہذیب، تاریخ، روح اور زندگی کا بہتا ہوا تسلسل ہے۔ اس کی بندش، تبدیلی یا ملکیت صرف فطرت کے ساتھ ہی نہیں، انسانیت کے ساتھ بھی خیانت ہے۔ آخر میں ناول بصیرت افروز مکالمے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ نہ صرف ماحولیاتی بیداری کا ایک نکتۂ عروج ہے، بلکہ آنے والے وقت کے لیے فکری ورثہ بھی ہے:

"وہ ایک آواز میں پکارے جا رہی تھیں۔ "پانی مر رہا ہے، پانی مر رہا ہے۔ اس دیوار میں پانی مر رہا ہے۔"(۷)

آمنہ مفتی کا یہ ناول فکری بصیرت کا شاندار نمونہ ہے۔ "پانی مر رہا ہے" جیسے الفاظ فرد اور معاشرے کی وہ خاموش مجرمانہ شراکت کو ظاہر کرتے ہیں جو فطرت کی تباہی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انتہائی سادہ دل دہلا دینے والے جملے میں سمیٹا ہے: "صدیاں گزر گئیں، پانی آج بھی مر رہا ہے۔" یہ جملہ نہ صرف ماحولیاتی تنقید کا نچوڑ ہے، بلکہ ایک فلسفیانہ و اخلاقی سوال بھی چھوڑ جاتا ہے۔

خالد جاوید کا ناول ایک خنجر پانی میں معنویت اور علامتی تہوں سے بھرپور اہم ادبی تخلیق ہے، جو آغاز ہی سے آبی آلودگی اور اس کے مہلک اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انھوں نے ہمارے روزمرہ کے اعمال، طرزِ زندگی اور صنعتی ترقی کے اس رجحان پر سوال اٹھایا ہے جو ہمارے ماحول، بالخصوص پانی، کی آلودگی میں مسلسل اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ ناول کے اختصار میں ہی اثر انگیزی ہے۔ ابتدا میں ایک شخص پانی کی گدلاہٹ اور اس کی خرابی پر تشویش ظاہر کرتا ہے اور پھر اچانک اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ لمحہ محض ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک وسیع تر علامت میں ایسے سماج کی موت جو قدرتی وسائل سے لاتعلق ہے۔ کہانی کے پس منظر میں قاری کو کرونا کے دنوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے، لیکن ناول کی بنیادی فکری جہت پانی اور ماحولیات کا بحران ہے۔ خالد جاوید نے ایسے شہر اور ملک کا نقشہ کھینچا ہے جہاں صنعتی ترقی کے نام پر درختوں کا کٹاؤ اور فطری توازن کو بگاڑا گیا ہے۔ فیکٹریوں کے ذریعے مقامی پانی کو زہر آلود کیا گیا۔ یہ منظرنامہ ترقی کے نام پر بربادی کی اس عمومی روش کی نمائندگی کرتا ہے جو آج کے انسان کو فطرت سے دور اور ہلاکت کے قریب کر رہی ہے۔ خالد جاوید نے شہری و صنعتی ترقی پر طنز کے ذریعے یہ احساس دلایا ہے کہ انسان نے مشینی ترقی کی دوڑ میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے، مگر اس دوڑ میں قدرت کی سب سے قیمتی نعمت پانی کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔

> "یہ بھی ایک نئی سوسائٹی بن کر تیار ہوئی ہے۔۔۔ یہ جس زمین پر بنی ہے وہ پہلے ایک تالاب تھی جسے پاٹ پاٹ کر اور مٹی ڈال ڈال کر خشک زمین میں بدل دیا گیا ہے۔"(۸)

مصنف نے پانی کے ذخائر میں مسلسل کمی کی طرف واضح پیغام دیا ہے اور اس امر کی پیش گوئی بھی کی ہے کہ آئندہ نسلیں اس بحران سے نمٹنے کے لیے شدید مشکلات کا سامنا کریں گی۔

> "پانی کے ذخیرے ساری دنیا میں کم ہوتے جا رہے ہیں آئندہ سو سال میں ہمیں پانی کے بغیر خوش دلی کے ساتھ زندہ رہنا سیکھنا ہو گا اور نسلِ انسانی کو پانی کا کوئی متبادل ڈھونڈنا ہو گا۔"(۹)

خالد جاوید ایسے علاقے کا ذکر کرتے ہیں جہاں بورنگ کے ذریعے پانی فراہم کرنے کا دعویٰ کیا گیا، مگر وہ پانی پینے کے قابل ہی نہ تھا۔ شہر کی تعمیراتی سرگرمیوں نے فضا کو زرد دھوپ، دھند اور گرد و غبار سے بھر دیا، مگر افسوس کہ کسی کو اس ماحولیاتی تباہی کی پروا تک نہیں۔ لوگ بے حسی کے ساتھ پانی کو مزید آلودہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ناول میں کرونا کے پسِ منظر اور اس کے سیاسی حوالوں کو فنکارانہ مہارت سے کہانی میں شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس عالمی وبا کو پانی کے بحران سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ کئی کردار جو صاف پانی کی تلاش میں مارے جاتے ہیں۔ یہ صرف جسمانی ہلاکتیں نہیں بلکہ ایک زوال پذیر سماج کی علامت بھی ہے۔ کرونا کے دنوں میں پانی کی قلت، آلودگی اور ناقص نظامِ فراہمی نے صورتِ حال کو مزید سنگین بنا دیا۔ ناول میں بلدیاتی اداروں، خصوصاً میونسپل کمیٹی اور کارپوریشن کی بدعنوانی، لاپروائی اور انتظامی ناکامی کو دکھایا گیا ہے۔ یوں کہانی صرف آبی بحران تک محدود نہیں، بلکہ پورے نظامِ حیات پر بھرپور تنقید ہے، جو ہمارے سماجی زوال کی علامت ہے۔

> "وہ اس موت کو دیکھ کر روئیں گی جو وہاں آرام سے چہل قدمی کر رہی ہے۔ انسان موت سے ڈرتے تو ہیں لیکن اس کے قدموں کی حقیقی چاپ نہیں سن سکتے۔"(۱۰)

کہانی میں صورتحال اس نہج تک پہنچ گئی کہ پینے کے صاف پانی کی فراہمی مکمل طور پر بند ہو گئی۔ تب جا کر حکومتی سطح پر کچھ اقدامات کا آغاز ہوا، جن میں زیرِ زمین کھدائی کے ذریعے اس آلودگی کی اصل وجوہات کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی تاکہ مسئلے کی جڑ تک پہنچا جا سکے۔

"ہوا تو آلودہ ہوتی ہی ہے مگر سب سے زیادہ خطرہ پانی کے آلودہ ہونے کی وجہ سے درپیش ہے اور زیرِ زمین بھی پانی کی سطح نہ صرف کم ہوتی جارہی ہے بلکہ زہریلی بھی۔ یہ بھی ممکنات میں سے ہے کہ کبھی آگے چل کر پانی کے ذخیرے ختم ہو جائیں۔"(۱۱)

خالد جاوید نے پانی کی اہمیت کے حوالے سے کئی مذہبی نظریات اور سائنسی نقطۂ نظر کو بھی بیان کیا ہے۔ پانی ہر مذہب میں افضل اور محترم ہے۔ گویا ناول میں پانی ایک کردار کی صورت میں نظر آتا ہے۔

"پانی سب یاد رکھتا ہے۔ ساری دعاؤں اور بد دعاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ بولے گئے لفظوں کو کبھی اپنی یادداشت سے باہر نہیں جانے دیتا۔ اُس کا حافظہ دائمی ہے۔۔۔ پانی کوئی مستقل مقام یا مکان نہیں گھیرتا وہ بہتا ہے ہر مقام سے وہ وقت، کال، زمانہ اور موت کو اپنے سیال کندھوں پر لیے ہوئے گھومتا رہتا ہے۔ وہ پُراسرار حد تک پاکیزہ اور خطرناک حد تک تباہ کن ہے۔"(۱۲)

ناول میں پانی کی کمی سے گھر میں چھوٹے بچوں کو کھانے، یہاں تک کہ باتھ روم جانے سے بھی روکا جاتا ہے۔ گھر میں بچہ جو ٹی بی کا مریض ہے کھانس کر خون آلودہ الٹی سے نڈھال پڑا ہے۔ ایسی قابلِ رحم اور مشکل صورتحال ہے کہ تعفن سے تنگ آکر ماں اپنے بچے سے مر جانے کا کہتی ہے۔ نوبت یہاں تک ہے کہ بازار میں بھی پانی نہیں ہے۔ جب بچے کو کھانس کھانس کر پیاس لگتی ہے تو وہ پانی پانی کی فریاد کرتا ہے جس پر اسے چند بوندیں پانی کی دی جاتی ہیں۔ پانی کی سپلائی بند اور لوگ کربِ جاں سے نہ ہی جی پارہے ہیں نہ مر پارہے ہیں۔ مرنے کی دعا تو کر رہے ہیں پر وہ بھی قبول نہیں۔ پانی کی قلت کے باعث ایک شادی شدہ جوڑا، ایک دوسرے سے بیزار بلکہ ایک دوسرے کے وجود ہی سے نفرت کرنے لگا ہے۔ پانی کی سپلائی بدستور بند ہے۔ لوگ خدا سے معافی کی امید لگائے بیٹھتے ہیں:

"کیا خدا انسانوں کو اُن کے گناہ اور برے اعمال کے لیے ہمیشہ معاف ہی کرتا رہے گا۔ انسان جو گناہ کرنے سے کبھی دائمی توبہ تک نہیں کرتے تھے۔ خدا کا کام معاف کرنا اور رحم کھانا ہی نہیں، سزا دینا اور عذاب نازل کرنا بھی ہے۔"(۱۳)

اصل میں مصنف نے اس اندیشے کو ظاہر کیا ہے کہ اگر پانی نہ ہوگا تو کیا صورت بنے گی۔ جانوروں اور پرندوں کی موت کو بھی دکھایا گیا۔ یہاں تک کہ شاعر کی نظمیں بھی پانی کی قلت کے باعث سوکھ گئی ہیں۔ ناول میں توہم پرستی کا بھی ذکر ہے۔ یہاں تک کہ اس بھیڑ چال میں ہم سب ایک طرف چل پڑتے ہیں۔

"آدمی کے وجود میں وہ کون سا تیزاب پوشیدہ رہتا ہے جو اس کے ہر نیک اور عظیم جذبے کو جلا ڈالتا ہے۔ ہم نئے نئے دائرے بناتے ہیں، پھر خود ہی اُن میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔"(۱۴)

یہ ناول دہشت ناک اور جھنجھوڑنے والا ہے:

"پانی کے اندر چاقو کا ایک وار پانی کے اوپر، رائیگاں، بیکار۔ وہ ڈوب گیا۔ بس مچھلیاں پانی کے اندر اپنا راستہ بھول گئی ہیں کیونکہ اس بار مچھیرے جال لے کر نہیں آئے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو دبے ہیں۔"(۱۵)

خالد جاوید کا ناول ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ پورے سماج، تہذیب اور ماحولیاتی بحران کا عکس ہے۔ آبی قلت، ماحولیاتی تباہی، سیاسی بے حسی، اور تہذیبی زوال، اور پانی کی معنویت کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے جیسے پانی گدلا ہوتا ہے، ویسے ہمارا معاشرہ بھی آلودہ، کھوکھلا اور بے سمت ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہم دنیا کی ظاہری ترقی کے باوجود اندر سے تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ صاف پانی کی قلت کے ساتھ بیماریوں میں اضافہ اور فضا میں بڑھتی آلودگی درحقیقت اُس ترقی کی قیمت ہے جو انسان فطرت سے بے تعلق ہو کر حاصل کر رہا ہے۔ خالد جاوید نے ریاستی بے حسی

اور ان کا دیر سے جاگنے کو طنزیہ طور پر بیان کیا ہے۔ پانی پر ان کی یہ تنبیہ ہے کہ آئندہ جنگیں پانی کے حصول کے لیے لڑی جائیں گی۔ یہ پیش گوئی صرف ایک ادبی تخیل نہیں بلکہ جدید ماحولیاتی تحقیق اور تجزیاتی سچائی ہے۔

غرض تینوں ناولوں میں پانی محض ایک ضرورت نہیں بلکہ تہذیب، زندگی، فطرت اور طاقت کے استعارے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ بہاؤ ماضی کی تہذیبوں کا ماحولیاتی نوحہ ہے، پانی مر رہا ہے حال کے بحران کا منظر نامہ، جبکہ ایک خنجر پانی میں علامتی سطح پر فطرت و ماحول کی چپ کی کہانی سناتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1. ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص:۱۱۲۔۱۱۱
2. مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص۹
3. ایضاً، ص۲۶۹
4. آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، جولائی ۲۰۲۰ء، ص۴۵
5. ایضاً، ص۵۷
6. ایضاً، ص۶۴
7. ایضاً، ص۱۸۰
8. خالد جاوید، ایک خنجر پانی میں، دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۲۰، ص۳۱-۳۲
9. ایضاً، ص۳۳۱-۳۲
10. ایضاً، ص۷۹
11. ایضاً، ص۸۲-۸۳
12. ایضاً، ص۸۹-۹۰
13. ایضاً، ص۱۲۵
14. ایضاً، ص۱۳۹
15. ایضاً، ص۱۴۷

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Mumtaz Ahmad Khan, Doctor, **Urdu Novel ke Hama Geer Sarokar**, Lahore: Fiction House, 2012, p 111–112
2. Mustansar Hussain Tarar, **Bahao**, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1992, p 9
3. Aiza'n, p 269
4. Amna Mufti, **Pani Marr Raha Hai**, Lahore: Al-Faisal Nashiran-o-Tajiran-e-Kutub, July 2020, p 45
5. Aiza'n, p 57
6. Aiza'n, p 64
7. Aiza'n, p 180
8. Khalid Javed, **Ek Khanjar Pani Mein**, Dilli: Arshiya Publications, 2020, p 31–32
9. Aiza'n, p 331–332
10. Aiza'n, p 79
11. Aiza'n, p 82–83
12. Aiza'n, p 89–90

13. Aiza’n, p 125
14. Aiza’n, p 139
15. Aiza’n, p 147